© rasailojaraid.com

تنقید و تبصرہ

کچھ شکستہ داستانیں

اشرف عطا صاحب نے تحریک خلافت و ترک موالات، تحریک احرار، تحریک کشمیر، تحریک شہید گنج اور تحریک خاکسار کی مختصر روداد اور کچھ شکستہ داستانیں کے عنوان سے زیر نظر کتاب میں پیش کی ہے۔ چونکہ موصوف کی سیاسی زندگی کا آغاز خود تحریک خلافت میں شرکت سے ہوا ہے اس لئے یہ کتاب ایک لحاظ سے خود اُن کی آپ بیتی کی حیثیت رکھتی ہے۔

۱۸۳۱ء میں بالاکوٹ میں حضرت سید احمد شہید اور حضرت شاہ اسمٰعیل شہید کی شہادت کے بعد برصغیر میں احیائے اسلام کی وہ جدوجہد جو حضرت شاہ ولی اللہ کی فکری تجدید سے شروع ہوئی، اور آخر میں اُسے پنجاب کی سکھ حکومت سے ٹکرانا پڑا، ایک طرح سے ناکامی میں ختم ہوگئی۔ ۱۸۵۷ء میں اسی سلسلے کی ایک اور کوشش ہوئی اور وہ بھی ناکام ہوئی۔ اس کے بعد برصغیر کے مسلمانوں کے باشعور طبقے یا تو نئی تعلیم پا کر غیر ملکی حکومت کی نوکریوں کے حصول میں لگ گئے، یا ان کی کوششیں دینی مدارس کے قیام کی طرف مبذول ہوئیں اور ان مدارس سے بکثرت علماء فارغ التحصیل ہو کر نکلنے لگے۔ غرض ۱۸۵۷ء سے ۱۹۱۰ء تک برصغیر کے مسلمانوں پر بالکل مُردنی چھائی رہی۔ اور "سیاست" اُن کے ہاں عام طور پر شجر ممنوعہ سمجھی جاتی رہی۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہے کہ جیسے جیسے ادبی قدروں میں تبدیلی آتی گئی، مضامین کی تقسیم میں اس کا زیادہ سے زیادہ لحاظ کیا جانے لگا کہ ایک عنوان سے متعلق ساری چیزیں ایک جگہ آجائیں، پھر اس مضمون میں اگر کئی شاخیں نکل سکتی ہیں تو ایک شاخ کی چیز دوسری شاخ میں نہ آنے پائے، جس کی تعبیر کتاب، باب، فصل وغیرہ سے کی جاتی ہے اور پھر ان کتابوں، بابوں، فصلوں میں باہم ربط ایسا ہو کہ آدمی کا ذہن آسانی سے ایک کے بعد دوسرے مضمون تک پہنچ جائے، اور اسے درمیان میں خلا محسوس نہ ہو۔ یہی نہیں بلکہ طرز استدلال اور انداز بیان کا بھی اس میں بڑا دخل ہے، پُرپیچ عبارتیں، ژولیدہ انداز بیان متقدمین کا خاصہ بن گئی ہے، اور سہل نگاری، سلجھا طرز تخاطب، روانی بیان متاخرین کا۔!

حتّٰی کہ متقدمین اور متاخرین کی کتابوں کے درمیان فرق کرنے کی یہ اچھی خاصی دلیل بن گئی مثال کے طور پر حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب "الفقہ الاکبر" ہی کو لے لیجئے۔ محققین کی اچھی خاصی تعداد یہ کہتی ہے کہ یہ امام صاحب کی تصنیف نہیں ہے اور دلیل صرف یہ ہے کہ اس کے اسلوب اور ترتیب میں متاخرین کی سی چابکدستی ہے متقدمین کا اسلوب اتنا نکھرا اور ستھرا ہوا نہ تھا۔

خیر یہ تو نسبۃً کم مشہور کتاب کی بات ہے، حدیث کی مشہور اور صحیح ترین کتاب "الجامع الصحیح للبخاری" ہی کو دیکھئے، شروع سے آج تک محدثین ابواب و تراجم اور احادیث کے باہمی تطبیق و مناسبت میں اپنی فکری صلاحیتیں صرف کرتے آرہے ہیں۔ حتّٰی کہ حدیث اور ترجمۃ الباب کے درمیان مناسبت پیدا کرنا الجامع الصحیح البخاری کے سمجھنے اور سمجھانے کا اونچا معیار سمجھا جاتا ہے۔ کچھ یہی انداز امام ترمذی نے اپنے سنن کے ابواب کی ترتیب میں بھی اختیار کیا ہے۔ انھوں نے بعض جگہ دو ایسے ابواب کو ایک جگہ بیان کیا ہے جن میں بظاہر کوئی مناسبت نہیں معلوم ہوتی متقدمین کی کتابوں کا یہ عام انداز ہے، ان کے یہاں بظاہر دو ابواب میں ربط کا زیادہ اہتمام نہیں کیا گیا۔ اس کے برخلاف آپ متاخرین کی کتابوں کا اس نقطۂ نظر سے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مطالعہ کریں تو معلوم ہو گا کہ تدریجاً ربط کو اہم مقام حاصل ہوتا گیا، اور اب تالیف کا اہم ترین جزء یہ ہے کہ کتاب شروع سے آخر تک موتی کے پروئے ہوئے دانوں کی طرح مرتب و مربوط ہو۔ ہر فصل کا ایک مستقل مفہوم ہو، ہر فصل باب کی رعایت سے لائی گئی ہو اور ہر باب کتاب کے موضوع سے کھلا ہوا ربط رکھتا ہو۔

ادبائے متاخرین اور عرب اول کے انداز بیان کی اس وضاحت کے بعد مولانا انظر شاہ صاحب کی اس تشریح سے کس طرح اتفاق کیا جا سکتا ہے "قرآن میں ربط کا انکار کسی اور نے نہیں حضرت شاہ ولی اللہؒ نے کیا ہے۔"

قرآن میں ربط پر اصرار کرنے والوں کا محور

جیسا کہ ابتدا میں عرض کیا گیا ہے کہ جو مفسرین ربط پر اصرار کرتے ہیں وہ بھی تمام آیتوں کے درمیان ربط جلی (کھلا ہوا ربط) نہیں مانتے بلکہ کہیں ربط خفی اور کہیں اخفی مانتے ہیں۔ اور ربط اخفی کی حدیں کیا ہیں؟ اس کی وسعت کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے، کہ اس میں خیالی ارتباط، ضدین اور نقیضین (دو چیزوں کا باہم مخالف ہونا) بھی شامل ہے، اور یہ کہا جاتا ہے کہ علاقہ تضاد بھی تو ایک علاقہ ہے، جب ربط کی حدوں کو اتنی وسعت دی جائے گی، تو پھر یقیناً متقدمین ہوں یا متاخرین، ادباءِ عرب جاہلی ہوں یا چودھویں صدی کے مؤلفین سب کی کتاب میں ربط کی کوئی نہ کوئی قسم ضرور پائی جائے گی، ربط کے مفہوم کی اس وسعت کے بعد تو دنیا میں بہت کم کلام ایسے ہوں گے جن میں ربط نہ ثابت کیا جا سکے۔

تطبیق کی آسان شکل

اس طویل گفتگو کا خلاصہ یہ ہے کہ سیدنا الامام مولانا الشاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے یا ان کی طرح جن دوسرے مفسرین نے ربط کا انکار کیا ہے، اس کا محور دوسرا ہے، اور جو حضرات مفسرین ربط پر اصرار کرتے ہیں، وہ چیز دوسری ہے۔ خدا بھلا کرے علامہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سے جہاں باہر کے مسلمانوں کو فائدہ پہنچا، اور خود ملک کے اندر کانگریس کے پاؤں مضبوط ہوئے۔ اور اُس کا نام شہر شہر اور گاؤں گاؤں پہنچا، وہاں جیسے ہی اس تحریک کا نعرہ کم ہوا، مسلمانوں میں باہمی اختلافات شروع ہوگئے، اور اس تحریک کے دوران اُن میں جو اتحاد و یک جہتی پیدا ہوئی تھی، وہ سب ختم ہوگئی۔ اس کتاب کے بعد کے ابواب میں جن دوسری تحریکوں کا ذکر ہے، وہ سب اس دور کی پیداوار ہیں، جس میں مسلمان مختلف سیاسی احزاب میں بٹ گئے اور اکثر یہ احزاب ایک دوسرے کے خلاف صف آرا رہتی تھیں۔

تحریک خلافت و ترک موالات کے اس قدر مقبول ہونے اور شہروں کے علاوہ دور دراز دیہات تک اس کے پہنچنے میں جو چیز سب سے بڑھ کر ممد و معاون ثابت ہوئی وہ علمائے کرام اور انگریزی تعلیم یافتہ طبقوں کا اتحاد تھا۔ آخر الذکر طبقے خواہ کتنی بھی کوشش کریں اس طرح عوام میں نہیں جا سکتے، جس طرح علماء جا سکتے ہیں۔ چنانچہ اس تحریک کو جہاں انگریزی اسکولوں اور کالجوں سے کارکن طالب علم بھی ملے، وہاں بے شمار عربی مدارس سے علوم دینی حاصل کرنے والے طالب علموں اور علماء کا بھی تعاون حاصل ہوا اور اس طرح یہ تحریک اتنی وسعت اور قوت پا سکی۔ بدقسمتی یہ ہوئی کہ علماء اور نئے تعلیم یافتہ طبقوں کا یہ تعاون دیرپا ثابت نہ ہوا، اور اس کی وجہ سے تحریک خلافت سے مسلمانوں کو کوئی خاص فائدہ نہ پہنچا۔

اس زمانے میں مسلمانوں کی قومی جدوجہد پر جس کا حاصل مملکت پاکستان کا قیام ہے، کتابیں لکھی جا رہی ہیں، لیکن ہمارے خیال میں یہ تاریخ ادھوری رہے گی اگر اس میں وہ دور بھی شامل نہ کیا جائے، جب پہلے پہل برصغیر کے مسلمانوں میں انگریزی اقتدار کے خلاف ایک عوامی لہر اُٹھی اور یہ تحریک خلافت تھی۔ اس لحاظ سے یہ کتاب ایک مفید مطالعہ ہے۔

کتاب کے شروع میں پروفیسر محمد سرور کا ایک مبسوط مقدمہ ہے، جس میں یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ حصول پاکستان کی تحریک سے قبل ہماری وہ

© rasailojaraid.com